جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس

مُلک و مِلّت کے تقاضے اور

ہماری ذمّہ داریاں

پاکستان ایک بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے۔ اخلاقی انحطاط تو یاس انگیز تھا ہی۔ اب تخریبی عناصر بھی سرگرم ہو گئے ہیں۔ ان عناصر کے لیے فضا پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی۔ یہ فضا اس وقت ساز گار ہوتی ہے جب افرادِ معاشرہ میں یہ تاثر عام ہو کہ ملک میں معاشرتی انصاف نہیں ہے اور کہ جب تک موجودہ نظام نافذ ہے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایسے حالات میں افرادِ معاشرہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ یہ نظام تبدیل ہو۔ تبدیلی میں ہی انہیں امید کی کچھ جھلک نظر آتی ہے مگر موجودہ نظام کے تحت عالم یہ ہوا کہ سابقہ حکومت نے معزولی سے ایک دو ماہ پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ عمّالِ حکومت میں جو رشوت ستانی ہے اس کا علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اس وقت عمال کی نااہلی کے متعلق غالباً کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ نااہلی رشوت ستانی سے کم نہیں۔ نظم و نسق کے کارپردازوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ مغربی ممالک کی انتظامیہ کے تحت جو کام ایک گھنٹہ میں ہو جاتا ہے وہ ہمارے ہاں ایک سال میں نہیں ہو سکتا۔ یہ حال ہے نظم و نسق کی بدعنوانی اور نااہلی کا۔ وہ سیاست دان جو اعلان کر رہا تھا کہ اس ملک میں رشوت کا کوئی علاج نہیں۔ اس نے یہ کہا تو نہیں اور نہ وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اس رشوت اور نااہلی کی اصل ذمہ داری زیادہ تر مفاد پرست سیاست پر عائد ہوتی ہے۔ اصحابِ اقتدار راہِ راست پر چلنے والے ہوں تو نظم و نسق بھی درست ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی سیاست نہ صرف نظم و نسق کو سدھارنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی، بلکہ وہ خود اس کی خرابیوں کی ایک بڑی علت تھی۔ اب جہاں ایک طرف یہ ظاہر ہوا کہ حکومتی ڈھانچہ اصلاح طلب ہے وہیں معاشی بدحالی بھی منظرِ عام پر آ گئی۔ اور معاشی بدحالی کے ساتھ یہ احساس ابھرا کہ یہ ظلم و بے انصافی کا نتیجہ ہے۔ چند لوگوں نے دولت اکٹھی کر رکھی ہے جو انہوں نے محنت سے نہیں کمائی بلکہ اقتدار کے ناجائز استعمال سے پیدا کی ہے۔ اس سے افرادِ معاشرہ کے غم و غصہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملک کے غریب ہونے کی وجہ کوئی بدقسمتی ہو تو اور بات ہے لیکن اگر کچھ افرادِ معاشرہ اصحابِ اقتدار سے ساز باز کر کے امیر کبیر ہو جائیں،

جب کہ اکثریت مفلوک الحال ہو تو اس کا گہرا اثر ہونا قدرتی امر ہے۔ افراد معاشرہ کے غم و غصہ کی ایک وجہ اسلامی مساوات کی عدم موجودگی ہے۔ اس ملک میں حاکم و محکوم ہیں۔ چھوٹے اور بڑے ہیں۔ امیر اور غریب ہیں۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہیں مگر نہ امیر غریب کو اپنے برابر سمجھتا ہے اور نہ تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ کو۔ ان سب حالات سے جو بے اطمینانی پیدا ہوئی، اس کے ساتھ انتشار کے دوسرے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔ علاقائی تعصب، جسے ایک وقت میں اسلامی جذبہ نے دبا دیا تھا پھر زوروں پر ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہے کہ ایک گروہ دوسرے کے قتل عام پر آمادہ ہے دلوں میں نفرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ خدا کی پناہ!

آپ جب بھی ان خرابیوں کے منبع کی تلاش کریں گے تو ہمیشہ حکومتی ادارے تک پہنچیں گے۔ مشرقی پاکستان کو کیا شکایت ہے؟ یہی کہ ہمیں کاروبارِ حکومت میں کوئی عمل دخل نہیں۔ مغربی پاکستان نے ہمیں ایک نوآبادی بنا رکھا ہے۔ ملکی وسائل کا زیادہ حصہ مغربی پاکستان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان کے مخالفین سے پوچھئے کہ آپ یونٹ کو توڑنے پر کیوں مُصر ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہم پر حکومت نے بہت ظلم کیا ہے اور کہ عوام کا تو کوئی کام اس حکومت میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر دیکھا جائے کہ گرانی اتنی کیوں بڑھ گئی ہے؟ تو نرخوں کے اونچا ہونے کا سبب بھی عمّالِ حکومت کی بدعنوانی ہی ثابت ہوگا۔ عدلیہ کے متعلق سوال ہو تو پتہ چلے گا کہ عدلیہ کی تقرریوں میں ناجائز مقاصد کے لیے حکومت ہر وقت دخل اندازی کرتی ہے اور وہ اصحابِ اختیار جو عدالتوں کے ان احکامات کے باعث ان سے برافروختہ تھے کہ ان کے ذریعہ عدلیہ نے حکومتی ادارے کی دراز دستیوں سے افرادِ معاشرہ کی حفاظت کرنے کی کوشش کی تھی۔ عدلیہ کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد شروع کیے ہوئے ہیں۔ اس ملک کے عام اخلاقی انحطاط کے متعلق دریافت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر ذمہ داری اصحابِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے اس نے ہر کسی کو، جس کی اعانت وہ چاہتا تھا، کسی نہ کسی طریق سے رشوت دی اور اس طرح اس کو اپنا تائید کنندہ بنایا۔ کسی کو پرمٹ، کسی کو لائسنس، کسی کو ملازمت، کسی کو ٹھیکہ، کسی پیشہ ور کو معاوضہ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اس نے ایک گروہ اپنے معاونین کا پیدا کیا۔ لیکن ملک کے اخلاق کو تباہ کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے مخالفین پر ظلم کیا۔ ان کو مرعوب کیا۔ یوں اخلاق نہ موافقین کے باقی رہے اور نہ مخالفین کے۔

ذرا سوچیے کہ تقسیم کے وقت ملک کی کیا حالت تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت ہم کوئی بڑی اخلاقی بلندیوں یا کسی بڑی قوتِ ایمانی کے حامل تھے۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ تب کا اور اب کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس وقت اسلام

کی بنیاد پر بڑا اتحاد تھا۔ زمینداروں نے زمیندار لیگ کے خلاف اور صوبہ سرحد والوں نے علاقائی تعصّب کے حامیوں کے خلاف پاکستان کے حق میں ووٹ دیے تھے۔ اس وقت نہ تو اس قسم کی رشوت و نااہلی تھی اور نہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوئی تھی۔ المختصر قیام پاکستان کے بعد اقتدار ہمارے ہاتھ میں آگیا اور ہمارے صاحب اقتدار طبقہ نے اسے زیادہ تر اپنے ہی مفادات کے لیے استعمال کیا۔

اقتدار کی فطرت ہے کہ وہ اس شیطان کو جو انسان کے اندر ہے، ابھارتا ہے۔ یہ شیطان ہر لحظہ انسان کو بے راہ روی کا سبق دیتا ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اقتدار تو ایک نشہ ہے اور ہمارا ملک ایسا ہے کہ یہاں زر و جاہ کے لیے ایک جنون ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دولت کہیں سے ایک دم بہت سی مل جائے۔ کوئی نہ کوئی شان یا کوئی وجہ تفاخر حاصل ہو جائے۔ اس خواہش پر مستزاد یہ کہ کام کوئی نہ کرنا پڑے۔ مزاجوں میں حرص بھی ہے اور جاہ پرستی بھی۔ جب حالت یہ ہے تو یہاں اقتدار کا ناجائز استعمال کیسے نہ ہوتا۔ ایک انسان اقتدار کا ناجائز استعمال اسی صورت میں نہیں کرتا جب اسے:

۱۔ خوف خدا ہو۔

۲۔ وہ فطرتاً بدعنوانی سے متنفر ہو۔

۳۔ اسے قانون کا خوف ہو۔

۴۔ رائے عامہ سے متاثر ہو۔

۵۔ عوام کے سنگین محاسبہ سے ڈرتا ہو۔

۶۔ قومی درد ایسا ہو کہ اپنے مفاد کے لیے قوم کو نقصان نہ پہنچائے۔

ان میں سے کوئی وجہ اسے اقتدار کے ناجائز استعمال سے روکنے کے لیے موجود ہو تو وہ باز رہے گا ورنہ نتیجہ ظاہر ہے۔ تو یہاں کون سی وجہ تھی جو اس کو منع کرتی۔ خوفِ خدا کا تو ہمارے ملک کی عملی سیاست میں کوئی دخل کبھی ظاہر نہیں ہوا۔ فطرت کسی کی بعید ہو سکتی ہے لیکن شاذ و نادر ایسا ہوا ہو گا۔ ایسا قانون گویا یہاں کوئی ہے ہی نہیں جس کی گرفت صاحبِ اقتدار پر بھی ہو، وہ تو خود قانون ساز ہوتا ہے پھر ایسا قانون کیوں بننے دے۔ دراصل اس ملک میں ایک دیوار ہے۔ اس دیوار کے ایک طرف تو اربابِ اقتدار و عمّالِ حکومت ہیں اور دوسری طرف سارا ملک۔ جس شے کو آج کل قانون کی بالا دستی کہا جاتا ہے۔ وہ دیوار کی ایک طرف ہے، دوسری طرف ہے ہی نہیں۔ جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے۔ بدعنوانیوں

کے خلاف رائے عامہ ایک لحاظ سے تو موجود ہی نہیں اور اگر کوئی ہے تو اس کی پرواہ کسے ہے، رائے عامہ کے فقدان کا ذکر مجھے اس لیے کرنا پڑا کہ یہاں جس کسی نے بدعنوانی کی معاشرے نے کبھی اس کا احتساب نہ کیا۔

(یہ ایک ایسا پہلو ہے، جس کے متعلق مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ اعوام میں محاسبہ کی نہ جرأت ہے اور نہ طاقت اور نہ ہی اس کے لیے کوئی تنظیم ہے۔ قومی درد کا تو شاید ذکر ہی لاحاصل ہو۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ درد بالکل مفقود ہے۔ لیکن جہاں کہیں وہ موجود ہے وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اس ملک کی سیاسی زندگی پر اثر انداز ہو۔

سو یہ تو واضح ہوا کہ موجودہ حالات کی ذمہ داری حکومتی ادارہ کی ہے۔ لیکن یہ قصہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ بالکل غلط ہوگا کہ ہم سمجھ لیں کہ مجرم صرف صاحبِ اقتدار لوگ ہیں اور اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ ہم خود پہلے مجرم ہیں۔ اگر ہم صاحب اقتدار کے ساتھ تعاون نہ کرتے تو وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ ہمارا تعاون یہ ہے کہ ہم نے اصحابِ اقتدار کی مخالفت نہیں کی۔ کہیں کوئی اِکّا دُکّا اللہ کا بندہ ہوگا جس نے کچھ آواز اٹھائی ہو۔ لیکن وہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔ یقیناً معاشرے کے افراد نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ معاشرہ تھا ہی کمزور اور اس کے فعال افراد تھے ہی زر و جاہ کی پرستش کرنے والے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ شر کی مخالفت کرے اور اس کا فرض ہے کہ شر کی مخالفت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ اس کی زندگی ایک مسلسل جہاد ہے۔ اس دنیا میں ایک دائمی جنگ ہے خیر و شر کے درمیان، حق و باطل کے درمیان۔ مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی اعانت میں اور باطل کی مخالفت میں سینہ سپر ہو جائے

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ	مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان
رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا	لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اپنے اموال اور
بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ	اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ لوگ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۴۹ : ۱۵	صادقین میں سے ہیں۔

اس ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض تھا کہ وہ ہر ایسے نظام کے خلاف جد و جہد کرتا جس کی بنا مفاد پرستی، غصب اور ظلم پر تھی۔ پروردگار اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ہم شر کے مقابلہ میں خاموش ہوں۔ یہ ایمان کی کمزوری ہے جس پر وہ ہمیں عذاب سے ڈراتا ہے۔ ہم تو وہ قوم ہیں کہ جن پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر

کو فرض کیا گیا ہے۔ اگر ہم اپنے ملک میں علانیہ عوام کے حقوق غصب ہوتے دیکھیں۔ اگر یہاں بر ملا اقتدار ناجائز اغراض کے لیے استعمال ہو اور ہم اس کے خلاف آواز نہ اٹھائیں تو اللہ کا عذاب ہم پر نازل ہوگا۔ اگر قرآن و حدیث پر غور کیا جائے تو اس میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ پروردگار سختی سے ہم کو برائی کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھن عن المنکر و لتاخذن علی ید المسیئ و لتطرنہ علی الحق اطراء او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنھم

اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جیسے ان پر کی تھی۔

اور پروردگار نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

پس کیوں نہ تم سے پہلے کی قوموں میں (جن پر عذاب نازل ہوا) ایسے نیکوکار لوگ اُٹھے جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

بنی اسرائیل میں کفر کرنے والے لوگوں پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ان گناہوں سے نہ روکتے تھے جو وہ کیا کرتے تھے اور یہ بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے افراد کو تو اس دنیا میں بھی سزا ہر صورت میں ملتی ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ـــــ

اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی بھی تنگ ہوگی۔

لیکن جب باقی افرادِ معاشرہ ان کو منع نہ کریں تو عذاب سب پر نازل ہونے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے:

ان اللہ لا یعذب العامة بعمل	اللہ تعالیٰ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے باعث
الخاصة حتی یروا المنکر بین	اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک
ظھرانیھم وھم قادرون علی	ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے سامنے
ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا	برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انہیں رد کرنے کی قدرت
ذلک عذب اللہ الخاصة والعامة	رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں
(الحدیث)	تو پھر اللہ تعالیٰ عام اور خاص پر عذاب نازل کرتا ہے

جب مفاد پرست عناصر آئے اور انہوں نے اس ملک میں لوٹ کھسوٹ شروع کی تو ہمارا فرض تھا کہ اسی وقت اٹھتے اور اس کے خلاف ایک جہاد شروع کر دیتے لیکن ہم نے کیا کیا؟ جب بھی کسی باطل کے نمائندے نے اس ملک میں اقتدار حاصل کیا تو نہ صرف ہم نے اس کو دھتکارا نہیں بلکہ ہم نے اس کا استقبال کیا، اس کو مسند پر بٹھایا اور اس کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ ایک وہ وقت تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع شدہ لوگوں کو کہا کہ:

"اگر میں غلطی کروں تو کیا کرو گے؟"

تو ایک شخص آگے بڑھا اور کہا:

"اسی تلوار سے تیرا سر قلم کریں گے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا:

"جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟"

اس نے کہا:

"ہاں جانتا ہوں، امیر المومنین سے بات کر رہا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور کہا:

"تیرا شکر ہے پروردگا! ابھی ایسے انسان موجود ہیں کہ میں غلطی کروں تو میرا سر کاٹ کر رکھ دیں۔"

زندہ قومیں برائی کو برداشت نہیں کرتیں اس لیے ان کے حکومتی اداروں میں جرأت ہی نہیں ہوتی کہ بے راہ روی اختیار کریں۔ یہ درست ہے کہ اب وہ وقت نہیں کہ امیر غلطی کرے تو اس کا سر ہی کاٹ دو،

کیونکہ غرض تو اس سے مخلصی حاصل کرنے کی ہوتی ہے اور وہ اس کو معزول کرنے سے ہو سکتی ہے لیکن برائی کو برائی تو بہرحال کہنا چاہیے۔ اس کے خلاف جدوجہد تو لازم ہے۔ جب ایک قوم برائی سے نفرت کا علانیہ اظہار نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے قلوب میں برائی کا کچھ ردِّ عمل ہوا ہی نہیں۔ ہم اس سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہم اس کے خلاف احتجاج کیا کرتے ؛ دوسری وجہ شر کے خلاف جہاد نہ کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ انسان کوئی قربانی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے ارباب اقتدار کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو یا اس کے مال پر زد پڑے گی یا اس کی ذات پر۔ ہم نہ اپنا مال قربان کرنے کو تیار ہیں نہ اپنی جان۔ ہم تو اپنی عافیت چاہتے ہیں، کوئی وجہِ تفاخر چاہتے ہیں اور اس دنیا کی لذتوں کے طالب ہیں۔ شر کے خلاف جہاد کی مصیبت کے لیے ہم تیار نہیں اور اگر ہم جہاد کے لیے تیار نہیں تو پھر پروردگار ہمیں دے گا بھی کچھ نہیں۔ وہ تو ان کو دیتا ہے جو اس کی راہ میں قربانی کرنے والے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اخلاق اور ہمارے ایمان کا عالم تو یہی ہو، جو ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم بددیانت، خائن، فرض ناشناس، عیش پسند بنے رہیں اور پھر بھی پروردگار ہمیں اچھی زندگی دے تو یہ ہونے سے رہا۔ پروردگار ایسا نہیں کرتا۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اس کے رستہ میں جس قدر محنت کرو گے اتنا ہی پھل پاؤ گے :

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى انسان کا حق صرف اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اسلام کوئی عیش پسند دین نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل جہاد کا نام ہے۔ قرنِ اول کے مسلمانوں کو دیکھیے۔ انہیں کس قدر مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ ۱۳ سال تک تو مکہ میں انہوں نے اذیت کی زندگی گذاری اور پھر جب مدینہ میں آئے تو پروردگار نے کہا :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تمہیں
يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گذر
مَّسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا چکے ہیں ان کو سختی اور دکھ پہنچے اور وہ سخت مصائب میں
حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ڈالے گئے حتیٰ کہ رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ
مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ ایمان لائے تھے، بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

جو جہاد میں تساہل کرنے والے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے کہا :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ آپ کہہ دیں اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور

اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ	عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری
وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ	جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور مکان (حویلیاں)
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ	جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ	اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ
جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى	میں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ اپنا حکم (کوئی
يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ	عذاب) بھیجے۔

کفار کے ساتھ جنگوں میں اسلام پر ایسا وقت بھی آیا، جب خطرہ تھا کہ اسلام باقی ہی نہ رہے اور ایک وقت ایسا بھی تھا کہ حضورِ انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان بچانے کے لیے حضورؐ کے جان نثاروں نے اپنی جانیں دیں اور حضورؐ پر ہونے والے تمام حملوں کو اپنے اوپر برداشت کیا۔

ہمارے بزرگوں نے بڑی مصیبتیں اور مشقتیں جھیلیں اور پھر نتیجہ کیا ہوا، ایک عظیم جماعت انتہائی بلند روحانیت والی حضورؐ کی اور حضورؐ کے صحابہؓ کی کھڑی ہوگئی جس کا مقابلہ پوری تاریخ میں کوئی دوسری جماعت نہیں کرتی۔ اس جماعت کا ایک ایک فرد ایسا ہے کہ اس کا ثانی تاریخ میں آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتا لیکن اس مصیبت کا جس میں سے یہ جماعت گذری کیا اثر ہوا جو روحانیت مسلمانوں کی جماعت میں اللہ کے راستے میں تکالیف کو برداشت کرنے سے پیدا ہوئی اسی کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے دس سال کے اندر آدھی دنیا کی حکومت سنبھال لی اور پھر ایک ہزار سال تک انہیں اقوام عالم میں ایک بلند مقام حاصل رہا۔

اگر ہم اچھی زندگی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے مال اور اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اسلام کوئی عیش پسند مذہب نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ہر وقت جد وجہد میں مصروف رہنا ہے۔ یہی اس کی زندگی ہے۔ اگر ہم اس زندگی کو قبول نہیں کرتے تو گویا ہم اسلام کا بار برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ سو مسلمانو! اٹھو اور جہاد شروع کرو۔ ہر شر کے خلاف جہاد کرو۔ پہلے اس شر کے خلاف جو آپ کے اندر ہے پھر اس کے خلاف جو آپ کے باہر ہے۔ کبھی کسی برائی کو قبول نہ کرو۔ کبھی شر کے ساتھ راضی نامہ نہ کرو۔ تم اللہ والے ہو تم مشرک نہیں ہو کہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرو۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔